ڈاکٹر خالد علوی

سیکولرزم اور اسلام

مسلمان حکمرانوں کی بے تدبیری، بزدلی اور نالائقی اور مسلمان معاشروں کے فکری جمود اور اخلاقی تنزل کے باعث وہ منحوس گھڑی آئی جب مغربی استعمار ان پر مسلّط ہو گیا۔ مسلمانوں کی یہ شکست صرف عسکری نہ تھی بلکہ تہذیبی بھی تھی کیونکہ مغربی استعمار اپنے ساتھ تہذیبی ایجنڈا بھی لایا تھا۔ مغرب نے طویل غور وفکر اور مضبوط منصوبہ بندی کے بعد عالمِ اسلام کے لیے ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ اس میں جہاں جغرافیائی اکائیوں کی تشکیل تھی وہاں عالمِ اسلام کی تہذیبی وحدت کی شکست و ریخت بھی تھی۔ مسلم ہندوستان پر انگریزوں کا تسلّط، عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کرنا، وسطِ ایشیا کی مسلم ریاستوں پر روس کا تسلّط، مشرقی یورپ میں مسلمان قومیتوں کی مغلوبیت ہماری بدنصیبی کے چند پہلو ہیں۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ میں جہاں کہیں مسلمانوں کو مغلوبیت کا سامنا کرنا پڑا وہاں ایک ہی طرح کا منظرنامہ سامنے آیا۔ استعماری قوتوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں کا تہذیبی تشخص ختم کیا جائے اور ان معاشروں کا تاریخی تسلسل توڑ دیا جائے۔ یہ کام انہوں نے سیاسی حکمتِ عملی اور تعلیمی نظام کے ذریعہ سے حاصل کیا۔ مسلمان معاشروں میں انہوں نے ایسا طبقہ پیدا کر لیا ہے جو حیاتیاتی طور پر مسلمان معاشروں کا حصہ ہے لیکن تہذیبی طور پر وہ مغربی استعمار کی توسیع ہے۔

مسلم معاشرے آج جس تضاد کا شکار ہیں، اُن میں فرقہ وارانہ اختلافات کو بھی دخل ہے جس کے ذمہ دار مذہبی رہنما ہیں جو اپنی محدود فرقہ وارانہ سوچ کے باعث وسیع تر مسلم تہذیبی

تشخص کا شعور نہیں رکھتے اور بہت آسانی کے ساتھ دشمن کی بساط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس فرقہ وارانہ سوچ کا علاج ہوسکتا ہے کیونکہ اس کے ساتھ بہت محدود مفادات وابستہ ہیں اور اگر مخلصانہ کوششیں بروئے کار لائی جائیں تو شاید تعاون علی الخیر کی صورتیں پیدا ہوسکیں۔ مسلمان معاشرے ان فرقہ وارانہ اختلافات کے باوجود سلامتی کے لیے متحد ہوتے رہے ہیں اور انہیں اپنی بقاء کے لیے کبھی ایسا چیلنج پیش نہیں آیا جواب درپیش ہے۔

اس وقت اُمّتِ مسلمہ کو جو چیلنج درپیش ہے، وہ فکری تصادم کی صورت میں ہے۔ یہ تصادم مغربی استعمار کی وجہ سے پیدا ہوا اور اسی تصادم نے مسلمان معاشروں کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ مسلمان معاشرے آج باہمی جنگ میں مصروف ہیں اور باہم دست وگریباں ہیں۔ ایک ہی معاشرے کے مختلف گروہ ایک دوسرے سے اس قدر بے اعتمادی میں مبتلا ہیں اور ایک دوسرے سے اس قدر نفرت رکھتے ہیں کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے باہر سے امداد طلب کرتا ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اِن معاشروں کا ایک محدود گروہ اپنی مدد کے لیے باہر کی قوتوں کو امداد کے لیے پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ معاشرے کے فلاں قسم کے لوگ خطرناک ہیں، لہٰذا انہیں ختم کرنے کے لیے آپ ہماری مدد کریں۔ اس صورتِ حال سے ہمارے معاشروں کی بقا اور ان کے استحکام کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ سیکولرزم ہے۔ ہمارے یہاں ملّی درد رکھنے والے اور خطرے کا شعور رکھنے والے بزرگوں نے اس صورتِ حال پر دُکھ کا اظہار بھی کیا ہے اور تنقیدی جائزے کے ساتھ مسلمانوں کے زوال پر مرثیہ خوانی بھی کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو جدوجہد پر آمادہ بھی کیا اور صورتِ حال کو سمجھنے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے پر توجہ بھی دلائی۔ حالی اور اکبرالہ آبادی سے لے کر اقبال تک اور ابوالکلام سے سیّد مودودی تک ہر فرد نے کسی نہ کسی انداز سے مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کی اصل مصیبت فکری جمود و شکست خوردگی اور بے عمل غفلت شعاری ہے۔ ہمیشہ سے ہماری سب سے بڑی مشکل یہ رہی ہے کہ ہم مرض کی علامتوں کا علاج کرنے کی فکر کرتے ہیں، لیکن مرض کے اسباب تک پہنچنے سے دانستہ یا نادانستہ گریز کرتے ہیں۔ مسلمان معاشروں میں تضادات،

کنفیوژن اور اخلاقی بے راہ روی کا بنیادی سبب مغرب زدگی ہے۔ ہمارے اربابِ اختیار نے مغربی ماڈل کو بے سوچے سمجھے اپنایا ہے کیونکہ اس ماڈل کے پیچھے صدیوں کا تجربہ ہے۔ اس تجربے کا ادراک کیے بغیر اس کے نتائج کو اپنانا کبھی مفید ثابت نہیں ہوتا۔ مسلمان معاشروں کے پالیسی ساز اور لادین دانشور اسلامی تشخص کے خلاف اور سیکولرزم کے حق میں فضا ہموار کر رہے ہیں۔ پاکستان میں انہیں فکری دستوری بحث و مباحثہ میں شکست ہوگئی تھی اور یہ طے ہوگیا کہ پاکستان کی تقدیر اسلامی تصورِ حیات سے وابستہ ہے لیکن موجودہ دور میں نہ صرف اس بحث کا دوبارہ آغاز کیا گیا بلکہ عملاً سیکولرائزیشن کے حق میں فضا ہموار کی جارہی ہے۔

سیکولرزم مغرب کا تجربہ ہے۔ یہ دین و دُنیا کی تفریق کا نظریہ ہے جسے مغربی معاشروں نے صدیوں کی کشمکش کے بعد اختیار کیا ہے۔ ان کے ہاں چرچ اور اسٹیٹ میں اختیارات کی کشمکش کئی صدیاں جاری رہی۔ اہلِ مذہب اور اربابِ حکومت کے درمیان خونریز جنگ طویل عرصہ تک لڑی گئی، جس میں بالآخر چرچ کو شکست ہوئی۔ ان معاشروں نے چرچ کے ظالمانہ رویوں، پادریوں کی بے عملی اور نااہلی کے خلاف اپنا فیصلہ سنایا۔ اہلِ مذہب حیاتِ انسانی کی رہنمائی میں ناکام رہے۔ انہوں نے بعض خاص مسائل اور زندگی کے محدود گوشوں پر توجہ دی اور حیاتِ انسانی کے وسیع تر دائرے میں رہنمائی مہیا کرنے میں ناکام رہے۔ ان وجوہ کی بنا پر انسانی معاشرے میں جو کردار انہیں ادا کرنا چاہیے تھا وہ نہ کر سکے اور ان کے ہمہ پہلو کردار کے نتیجے میں جو معاشرتی تبدیلی آنا چاہیے تھی وہ نہ آسکی۔ اسی کشمکش میں چرچ کو شکست ہوئی اور دُنیاوی قوتیں کامیاب ہوئیں۔ ریاست کو بالادستی حاصل ہوگئی اور چرچ انفرادی مذہبی زندگی کے کونے تک محدود ہوگیا۔ ریاست کا مجموعی تسلط مستحکم ہوگیا۔ اہلِ مذہب نے اس صورتِ حال کا تجزیہ کیا اور شکست کو تسلیم کرتے ہوئے ریاست کی شرائط پر اس سے مفاہمت کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس مفاہمت میں دونوں کا دائرہ کار کا تعین ہوگیا اور دونوں نے ایک دوسرے کے دائرہ کار میں عدم مداخلت کی پالیسی کو اختیار کیا۔ بائبل کے بعض حوالوں سے اس پالیسی پر مہرِ تصدیق ثبت کی گئی۔ آج مغرب میں جو معاشرتی تصویر ہمیں نظر آتی ہے اس میں

چرچ اور اسٹیٹ کے درمیان مفاہمت بالکل عیاں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ مغرب کی بالادستی کے عالمی پروگرام میں دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ مذہب و سیاست میں کشمکش کا جو تجربہ تھا بالآخر مفاہمت پر منتج ہوا اور اب ان کے ہاں کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ اس وقت مغربی معاشرے خواہ وہ امریکی ہوں یا یورپی ہر دو میں چرچ کی حیثیت ایک پریشر گروپ کی ہے۔ یہ گروہ معاشرتی دباؤ کے تمام حربے استعمال کرتا ہے اور اپنے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوتا ہے۔ عیسائی پادریوں نے مغربی استعمار کی کامیابی میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا ہے اور محکوم و مغلوب قوموں کو مغربیت میں رنگے جانے میں پوری معاونت کی ہے۔ اس طرح عیسائی بنانے کی مہم میں بھی استعمار نے چرچ کو مکمل حمایت مہیا کی ہے، انہیں تحفظ فراہم کیا اور ان کی سرگرمیوں میں مالی اعانت بھی فراہم کی۔ استعماری مقاصد کی تکمیل، عیسائیت کے فروغ، مغربی تہذیب کے غلبے، معاشی استحصال اور اب عالمگیریت کی کامیابی میں عیسائیت اور استعماریت شریکِ کار کی حیثیت سے چل رہی ہیں۔ عیسائیت کی فرقہ وارانہ تقسیم کے تحت مختلف کلیسا وجود میں آئے ہیں اور ان کے تحت متنوع تنظیمیں تشکیل پائی ہیں جو غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) اور مذہبی جمعیتوں کی صورت میں تعلیم، صحت اور انسانی خدمت کے میدانوں میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کے پیچھے اصل قوت چرچ ہی کی ہوتی ہے۔ چرچ ایک منظم اور طاقتور انسٹی ٹیوشن کی حیثیت سے مغرب میں اب بھی اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ باوجودیکہ مغرب کی پالیسی سازی اور اس کے عملی اقدامات میں چرچ کا براہِ راست کوئی دخل نہیں تاہم ایسا کبھی نہیں ہوا کہ چرچ نے کوئی رائے اختیار کی ہو اور بالآخر وہ غالب نہ آیا ہو۔ ماضی قریب میں اس کی ایک مثال مشرقی تیمور کی ہے۔ (انڈونیشیا کا ایک چھوٹا سا جزیرہ جو تیل کی دولت سے مالا مال ہے)۔ اس جزیرہ پر پرتگالیوں کا تسلط تھا جس پر بعد میں انڈونیشیا نے قبضہ کیا۔ یہاں کے ایک پادری نے خاموشی سے ایک مہم شروع کی کہ یہاں عیسائیوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے خطوط سائیکلو سٹائل کر کے برطانیہ سمیت تمام مغربی ممالک میں تقسیم کیے جاتے رہے۔ یہ خطوط مسلم و غیر مسلم تنظیموں کو بھی بھیجے

جاتے تھے۔ آسٹریلیا سمیت مختلف مغربی ملکوں کے چرچوں نے اسے اپنی مہم کا حصہ بنایا اور بالآخر اقوامِ متحدہ نے اسے بطور پالیسی کے اپنا لیا۔ برطانیہ سے لے کر آسٹریلیا تک اور ہالینڈ سے لے کر امریکہ تک کلیسا کی کوئی تنظیم ایسی نہ تھی جس نے اس مسئلہ پر فعال طریق پر حصہ نہ لیا ہو۔ بین الاقوامی کلیساؤں نے اتنا دباؤ بڑھایا کہ یہ انسانی حقوق کا مسئلہ قرار پایا۔

اقوامِ متحدہ نے سیاسی، انسانی مسئلہ حل کرنے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ مغرب کی پوری سیاسی معاشی اور عسکری قوت اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مستعد تھی۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ مشرقی تیمور، ریفرنڈم کے نتیجے میں آج ایک آزاد ملک ہے۔ فلسطین، کشمیر، چیچنیا، تھائی لینڈ اور فلپائن کے مسلمان برسہابرس سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اقوامِ متحدہ اور انسانی حقوق کا علمبردار مغرب ان کی طرف توجہ نہیں کرتا اس لیے کہ وہ مسلمان ہیں اور عالمی استعماری منصوبہ بندی میں ان کی کوئی حیثیت نہیں بنتی۔

سیکولرزم ایک نظریہ کے طور پر مقبول ہوا اور مغرب کی تمام ریاستوں نے اسے بطور ریاستی پالیسی کے اختیار کر لیا۔ اس دوران میں اس کے فروغ کے لیے جارحانہ پالیسی اختیار کی گئی اور اس کے حق میں سیاسی پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ علمی اور تہذیبی دلائل بھی دیے جاتے رہے۔ مذہب کی چیرہ دستیاں، عیسائیوں کی فرقہ وارانہ آویزش اور مظالم، عیسائی پادریوں کی بداعمالیاں اور پھر مذہب کی غیر عقلی تعلیمات اور اس کے محدود تصورِ حیات و کائنات کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا رہا۔ انسان اور اس کی معاشی و معاشرتی ترقی پر اثر انداز ہونے والی رکاوٹوں پر بحثیں ہوتی رہیں۔ دلائل کا انداز فلسفیانہ بھی تھا اور متکلمانہ بھی، معاشرتی بھی اور تاریخی بھی، لیکن بات کو محض دلائل اور بحث و مباحثہ تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ ریاست نے بھی اسے بطور پالیسی اختیار کیا اور پھر بہ جبر اسے نافذ کیا۔ ریاست کی [illegible]تی تنظیم میں اسے پالیسی فریم ورک کے طور پر اختیار کیا گیا اور ایک ضابطے اور اصول کے تحت اسے اپنا لیا گیا۔ چرچ کی ہم خیال مذہبی قوتوں اور سیکولرزم سے نظریاتی اور فکری اختلاف رکھنے والے [illegible]ں کو کونے میں لگا دیا گیا۔ جدید مغربی تہذیب کی پوری اُٹھان لادینی ہے۔ سیکولرزم جدید تہذیب کی روح ہے۔ عیسائیت

اس تہذیب کا ایک جزو (Component) ہے لیکن اس کی روحانی تاثیر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ سیکولرزم کا آغاز و انجام مادیت اور حسیت ہے۔ ترقی کے تمام پیمانے مادی ہیں۔ مغربی معاشرے سیکولرزم کے نتیجے میں مادیت اور حسی لذتوں کے حصول کی جدوجہد کا نمونہ ہیں۔ یہی مادی اور حسی کلچر وہ پوری دُنیا میں بزور نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ سیکولرزم پر مبنی جو تہذیب پروان چڑھتی ہے وہ بے خدا، بے روح، غیر اخلاقی اور پُرتشدد ہے۔ مغربی تہذیب کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ:

Western civilization is the most violent and ruthless of all civilizations.

اس تہذیب کی یہ خصوصیت اسی نظریے کا ثمر ہے جس پر اس کی تعمیر ہوئی ہے اور وہ نظریہ سیکولرزم کا نظریہ ہے۔ سیکولرزم کی تعریف:

سیکولر رویے کے پیچھے اگرچہ مذہب و ریاست کی کشمکش کی تاریخ ہے، لیکن یہ اصطلاح بہت بعد میں متعارف ہوئی۔ یہ اصطلاح برمنگھم کے ایک مدرس جارج جیکب ہولی اوک سے منسوب ہے۔ اس نے ۱۸۴۰ء میں جن خیالات کا اظہار کیا ان کے لیے سیکولرزم کی اصطلاح استعمال ہوئی۔ یہ اصطلاح اس سیاسی نظریے اور تہذیبی رویے کے لیے استعمال ہوئی جو یورپ نے عیسائیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے:

سیکولرزم کی اصطلاح عام طور پر ریاست و انتظام کو مذہبی یا کلیسائی معاملات سے علیحدہ منظم کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ سیکولر تعلیم سے مراد وہ نظام ہے جس میں مذہب کی متعین ہدایات کو شامل نہیں کیا جاتا۔[۱]

انسائیکلوپیڈیا امریکانہ میں اس کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

یہ ایک ایسا نظام ہے جس کی بنیاد فطری اخلاق اور الہامی مذہب یا ماورائے فطرت (Supernatural) آزادی کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یعنی ہر انسان کا حق ہے کہ وہ اپنے

متعلق سوچ سکے، ہر طرح کے موضوع پر اختلافِ رائے کا اظہار کر سکے اور ہر طرح کے موضوعات جیسے خدا، روح کا غیر فانی ہونا وغیرہ پر بحث و تمحیص کر سکے۔[۲]

اس نظریے کے تحت ریاست کا انتظام مذہبی حوالے کے بغیر تشکیل پاتا ہے اور ریاست کے تمام ادارے مذہبی ہدایات سے آزاد ہو کر کام کرتے ہیں۔ Penguin Dictionary of Politics میں سیکولر ریاست کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

سیکولر ریاست سے مراد ایک ایسی ریاست ہے جو سرکاری سطح پر کسی مذہبی تحریک یا منصب سے تعلق نہ رکھے۔ انگلستان اِس بنا پر سیکولر نہیں کہ وہاں چرچ آف انگلینڈ کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح سیکنڈے نیویا کے ممالک (ڈنمارک، ناروے وغیرہ) میں لوتھرن چرچ کی سرکاری حیثیت ہے جس کے عہدہ دار بڑی حد تک سول ملازمین شمار ہوتے ہیں۔ البتہ امریکہ ایک سیکولر ریاست ہے کیونکہ ایک قانونی دفعہ کے تحت سرکاری طور پر کسی چرچ کے قیام کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ عملی طور پر اس اصطلاح کا اطلاق ان ممالک پر ہوتا ہے جہاں حکومتی منتظمین کسی طرح کی مذہبی وابستگی نہ رکھتے ہوں۔ اس تعریف کی رُو سے انگلستان، امریکہ اور سیکنڈے نیویا کی ریاستیں سیکولر ہی کہلائیں گی۔[۳]

ہارورڈ یونیورسٹی کے مسیحی متکلم ہاروے کوکس (Harvey Cox) نے سیکولرزم کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ عام طور پر مغربی دانشور سیکولرزم کو محض مذہب و سیاست کی سادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ گویا یہ ایک معصوم اور بے ضرر سی پالیسی ہے جس میں ریاست مذہب کے بارے میں غیر جانبدار ہوتی ہے اور ہر شخص انفرادی زندگی میں اپنے مذہبی تصورات پر عمل پیرا رہ سکتا ہے اور ریاست اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی۔ ریاست صرف اپنے معاملات کے انتظام میں کسی ایک مذہب کے ساتھ ترجیحی رویہ نہیں رکھتی۔ مسلمان معاشروں کے اربابِ اختیار اور سیکولر دانشور بھی یہی ملفوف نظریہ پیش کرتے ہیں اور اسی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہاروے کوکس نے اسی منافقت کا پردہ چاک کیا ہے اور سیکولرزم کی نظریاتی بنیادوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق سیکولرزم کا اپنا علم کلام اور واضح اساسی نظریات

ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ سیکولرائزیشن تین بنیادوں پر قائم ہے: ماورائی ماخذ کا انکار، اخلاقی اقدار کا عدم استقلال اور سیاست سے تقدس کے تصور کا اخراج۔ انہی تین بنیادوں پر سیکولرزم کا فلسفۂ حیات قائم ہے۔ آیئے کوکس (Cox) کی زبان میں اسے دیکھتے ہیں۔ وہ اگرچہ سیکولرزم اور سیکولرائزیشن میں تفریق کرتا ہے اور سیکولرائزیشن کے حق میں بائبل سے دلائل لاتا ہے لیکن یہ ایک سطحی بنیاد ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتا ہے:

ماورائی ماخذ سے نجات

مذہب بنیادی ماوراء الطبیعات مصدر سے رہنمائی پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک خدا یا ایک سے زیادہ خدا، روحانی قوتیں، فرشتے یا ارواح جیسی غیرمرئی طاقتیں ہیں جن سے رابطے کی صورت میں انسانی زندگی خوشحالی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ مذہب کی قوت یہ ماورائی مصدر ہوتی ہے اور مذہب اسی حوالے سے مادی دُنیا میں مستحکم ہوتا ہے۔ سیکولرزم اسی مصدر کا انکار کرتا ہے اور انسان کو اپنی ذات اور اپنے ماحول سے رہنمائی پر آمادہ کرتا ہے۔ مذہبی زبان، مذہبی استدلال اور مذہبی محاورے اس تصورِ حیات و کائنات کی اساس ہیں جسے غیرمرئی ماخذ کنٹرول کرتا ہے۔ کوکس کے مطابق اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر مادی وجود مستحکم نہیں ہوسکتا۔

کوکس (Cox) ڈچ مصنف سی اے وان پرسن (C.A. Van Peurson) کے حوالے سے لکھتا ہے:

Deliverance of man from religious and transform metaphysical control over his reason and language. It is loosening of the world from religious and quari religious understanding of itself, the dipelling of all closed world symbols. Secularisation when man turning his attention away

from world beyond and towards his world ánd this time.[4]

سیکولرزم نے جو تصور حیات و کائنات متعارف کرایا ہے اس میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ خدا کا کوئی فعال کردار نہیں۔ انسانی عظمت اور انسان دوستی زندہ تصورات قرار دیئے گئے۔ نیچرل سائنس، سوشل سائنسز اور فلسفہ و ادبیات میں ان تصورات کو مستحکم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ماوراء کا تصور سیکولر افکار میں تحقیر و تضحیک کا نشانہ بنا، جو تصور مذہبی یقینیات کی اساس شمار ہوتا تھا، وہ نا قابلِ دفاع اصطلاح بن گیا۔ سیکولر علم کلام خالص تجزیاتی، تجرباتی، مشاہداتی اور عقلی بنیادی پر استوار ہوا۔ وجدانی دبستان میں اگر کچھ لوگ حیات سے ذرا بلند ہوئے ہیں تو انسان کی باطنی قوتوں کی نفسیاتی شناخت اور روحِ عصر اور روحِ کائنات جیسی مبہم تعبیرات کے ذریعہ سے بے خدا تصورِ حیات و کائنات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سیکولرزم کے پس منظر میں چونکہ یونانی و رومی مشرکانہ اور حسی کلچر تھا اس لیے غیر مرئی اور وراء الوراء (Transendant) خدا کی تخلیقی و تدبیری جلوہ آرائیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

نظامِ حیات کو خدائی رہنمائی سے محروم کرنے کے بعد اسے مادی و انسانی حوالے سے منظم کرنے کے لیے مہم جوئی کی گئی۔ جدید مغربی ریاستوں نے سیکولرزم کے نفاذ کو اپنی پالیسی کا سنگِ بنیاد قرار دیا اور اس پر عمل درآمد کی حکمتِ عملی طے کی۔ اسے سیکولرائزیشن کا نام دیا گیا۔ اس حکمت عملی کے تین اصول قرار دیئے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کوکس (Cox) اسے بیان کرتے ہوئے بائبل سے سند لاتا ہے:

The integral components in the dimension of secularization are disenchantment of nature, desacralization of politics and the deconsecration of values. Thus the disenchantment of nature beings with creation, the desacralization of values especially with its prohibition of idols.[5]

فطرت سے تصادم

سیکولر تصورِ حیات فطرتِ انسان کی ترقی اور اس کے غلبے کی راہ میں رکاوٹ ہے، لہٰذا اس کی تسخیر اور اس پر غلبہ حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ فطرت کا احترام اور اس سے سازگاری، اس کا خوف اور اس کی پرستش کی جگہ اس کی تسخیر کا تصور اُجاگر ہوا۔ سائنسی ترقی اور ایجادات کی روح یہی احساسِ برتری ہے۔ اقبالؒ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

تسخیر کائنات مغرب کا نصب العین ہے اور اس سلسلے میں اس نے واقعی ایجادات و انکشافات کی ایک دُنیا آباد کی ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں بپا انقلاب نے اسے دنیا میں غلبہ عطا کیا ہے۔ اسے فی الواقع سیادت و امامت کا درجہ حاصل ہے۔ اس تصور میں ایک بنیادی فکری خامی پنہاں ہے اور وہ فطرت اور کائنات کو ایک مخالف و مدِّ مقابل قوت قرار دینا ہے۔ تسخیر کا سارا فلسفہ اس تصور پر قائم ہے کہ فطرت و کائنات انسان کے مخالف و مزاحم ہیں لہٰذا اسے زیر کرنے، کنٹرول کرنے اور مغلوب کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ فطرت کی طاقتوں کو کنٹرول کرنے اور اسے کام میں لانے کے لیے اس کے مخالف ہونے کا تصور کیا ضروری ہے؟ یہی وہ نکتہ ہے جسے سیکولر دانشور نظرانداز کرتے ہیں۔ خالقِ کائنات نے اس میں ایک نازک توازن قائم کر رکھا ہے جو اس کی تخلیق و تنظیم کا حصہ ہے۔ انسان نے اپنی طاقت کے نشے میں اس نازک توازن کو بگاڑنا شروع کیا ہے۔ اسے اس کا قدرے احساس ہوا ہے اور اب ماحولیات کے عنوان سے فطرت کے ساتھ سازگاری کے قدرتی تصور کی طرف آ رہا ہے۔ Green house effect اور Environmental protection جیسے نعرے ایجاد کر رہا ہے لیکن سیکولر مغرب کا غرور اور خدا بیزاری اسے اعتدال کی راہ پر لانے میں رکاوٹ ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ سیکولر مغرب کا یہ طرزِ عمل کسی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ

انسان اور فطرت کے درمیان تسخیر و تصادم کے سوا کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے؟ موافقت و سازگاری اور انتفاع و منفعت اندوزی کا تعلق ممکن نہیں ہے؟ اگر مثبت رویہ اختیار کیا جائے تو سائنسی و تکنیکی انکشافات و ایجادات رُک جائیں گی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات سیکولر جارحیت کے نمائندوں پر واجب الادا ہیں۔

سیاست کی عدم تقدیس

مذہب و سیاست کی کشمکش ہی نے سیکولرزم کو جنم دیا، اس لیے سیکولر دانشوروں اور سیاسی منتظمین نے سیاسی سرگرمیوں کو تقدیس کے اثرات سے محفوظ کیا۔ تقدس کے تصور کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ذرا مذہبی حقیقتوں کا جائزہ لے لیں۔ مذہب چونکہ ماورائی ماخذ سے قوت حاصل کرتا ہے اس لیے مذہبی حقیقتیں نا قابلِ گرفت ہوتی ہیں۔ بعض مذہبی تصورات جو ماورائی ماخذ سے ماخوذ ہیں انہیں خدائی نسبت سے تقدس کا درجہ حاصل ہو جاتا، ان پر ایمان لایا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت مسلمات کی ہوتی ہے۔ لہٰذا انہیں خدائی نسبت سے تقدس کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ سیاست کو غیر مقدس قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی اخلاقی و روحانی پہلو کو نہیں تلاش کیا جائے گا۔ چونکہ سیاست اقتدار حاصل کرنے، اقتدار کو ختم یا قائم رکھنے اور ریاست کی تنظیم کرنے کا نام ہے، اس لیے مقاصد کے حصول کے لیے ہر قسم کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ان سرگرمیوں کو اخلاقی و روحانی اقدار کی پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ سیاسی قوت کا استناد کسی ماورائی ماخذ سے حاصل نہیں کیا جائے گا۔ ہر سیاسی عمل کی سند خالص انسانی ہوگی۔

By desecrilization of politics they mean the abolition of sacred legitimation of political power and authority, which is prerequisit of political change and hence also a social change.[6]

اسے آپ پاپائیت کے عیسائی تصور میں دیکھ سکتے ہیں۔ پاپائیت Theocracy ایسا سیاسی نظام ہے جس کو مذہبی رہنما و پادری چلاتے ہیں۔ یہ نظام کسی منظم مذہب کے عقائد پر چلایا جاتا ہے۔[۷] پاپائیت میں مذہبی گروہ کو سند کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ خدا کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے ان کی ہر بات مستند ہوتی ہے اور اس کے خلاف بات نہیں کی جا سکتی۔ عیسائیت میں سیاسی اقتدار کے استعمال کی کوئی مثال حضرت مسیحؑ کی زندگی سے نہیں حاصل جا سکتی، لہٰذا چرچ نے یہ روایت اپنے اجتہاد سے نافذ کی اور یورپ کو یہ حیثیت حاصل ہوگئی کہ وہ مسیحؑ کی نمائندگی کرے۔ استدلال کچھ اس طرح سے تھا۔ چرچ مسیحؑ کی ذات کا نمائندہ ہے اور پوپ چرچ کا نمائندہ، اس لیے پوپ کا فیصلہ مسیحؑ کا فیصلہ شمار کیا جائے گا۔ پاپائیت نے اپنے عہد اقتدار میں ایسے اقدامات کیے جو بالآخر اس کے زوال پر منتج ہوئے۔ اہلِ کلیسا نے جو مذہبی فریم مرتب کیا وہ حیاتِ انسانی کے مسائل کو حل کرنے کے قابل نہ تھا۔ مذہبی رہنماؤں نے ایسے نظریات کو مسلمات کا درجہ دیا جو قابلِ نفرت تھے۔ اہلِ کلیسا کا ذاتی کردار بھی قابلِ رشک نہ تھا۔ رہبانیت کے خلاف نظامِ فطرت نے اہلِ مذہب کی بداعمالیوں کی ایسی صورت پیدا کی جو انسانی شرف کے لیے بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسیحؑ کی دعوت میں سیاسی اقتدار کے حوالے سے کوئی واضح پروگرام موجود نہ تھا اس لیے عیسائیت کو سیاسی اقتدار کے سلسلے میں اپنا موقف متعین کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

سیکولرائزیشن کی حکمتِ عملی

ہاروے کوکس سیکولرزم اور سیکولرائزیشن میں فرق کرتا ہے:

Secularization implies a historical process almost certainly irreversible, in which society and culture are delivered from tutelage of religious control and closed metaphysical worldviews. We have argued that it is basically a liberating

development. Secularism on the other hand, is the name for an ideology, a new closed worldview which functions very much like a new religion. While Secularization finds its roots in the Biblical faith itself and is the some extent an authentic outcome of the impact of Biblical faith on western history. This is not the case with secularism. It is a closed "ism".[13]

سیکولرزم کو وہ ایک ازم اور بند تصورِ حیات قرار دیتا ہے اور سیکولرائزیشن کو بائبل کے تصورِ تخلیق، بنی اسرائیل کے خروج از اسرائیل (Exodus)، سینا میں بت پرستی اور ربانی ہدایت سے مستنبط کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیکولرائزیشن سیکولرزم کو نافذ کرنے کا طریقِ کار ہے۔ نظریاتی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ مغرب میں اس کے نفاذ میں زیادہ دقّت اس لیے پیش نہیں آئی کہ عیسائیت کا تصورِ خدا الجھا ہوا تھا۔ عقیدہ تثلیث کے پیشِ نظر خدائے خالق مسیحؑ کی ذات سے اس طرح مربوط ہے کہ اسے نظامِ کائنات سے محدود سروکار ہے۔ یونانی فلسفے، یونانی کلچر اور رومی ریاست کے پس منظر میں چرچ اور ریاست اپنے تعلق کا فیصلہ نہ کر سکے۔ اس کشمکش نے الجھاؤ پیدا کیا۔ یورپ کے بادشاہوں نے Divine right of the king کے تحت اپنے اختیارات کو خدا کی طرف منسوب کیا۔ پھر یونان اور روم کے مشرکانہ کلچر کے اثرات بھی تھے جس میں دیوی دیوتاؤں کے معاملات اور اخلاقی بے راہ روی کے مظاہر یورپی تاریخ کا حصہ ہیں۔ عیسائیت میں خدا کی حاکمیت کا کوئی تصور نہیں لہٰذا پوپ جب خدا کی نمائندگی میں اقدام کرتا ہے تو اس کی سند بائبل نہیں چرچ کے اپنے فیصلے ہیں جنہیں وہ الہامی سمجھتے ہیں۔ یورپی معاشرے میں اگرچہ عیسائی اخلاق کے اثرات رہے ہیں اور بادشاہوں اور اربابِ اختیار کی آزاد رَوی کے باوجود مسیحی اخلاق کی گرفت مضبوط تھی۔ سیکولرائزیشن نے سب سے پہلے اخلاقی اور معاشرتی قدروں کو نشانہ بنایا۔ فرد کی آزادی کے نام پر خاندان کے ادارہ کو نشانہ بنایا۔ عورت کی خاندانی

ذمہ داریوں کو کم تر اور بوجھ قرار دے کر اسے مارکیٹ میں لایا گیا۔ اس طرح وہ دوسرے افراد معاشرہ کے ساتھ مسابقت کی دوڑ میں شامل ہوگئی۔ دین کا دفاع اخلاقی اور معاشرتی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ ایک دینی انسان ان دیکھے خدا کی قدرت کے پیشِ نظر بعض معاشرتی رویوں اور اخلاقی قدروں کا لحاظ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ خدائی حوالہ ختم ہو جائے تو پھر خواہشات و مفادات کے تحت رویوں اور رجحانات کی تشکیل ہوتی ہے۔ مغرب میں اخلاقی قدروں کی معروضیت نے آزادانہ رویوں کو پروان چڑھایا۔ آزاد جنسی تعلق، ہم جنس پرستی، والدین کی نافرمانی اور جرائم کی افزائش نے ان معاشروں کو بے سکونی کا جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ مغرب کا سیکولر معاشرہ سیاسی اداروں کو مستحکم کر سکا ہے۔ جمہوری عمل کے نتیجے میں ان کی ریاست اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ لیکن ان کی معاشرت انتشار کا شکار، اخلاقی حالت ابتر اور چرچ ویران ہو رہے ہیں۔ ''عبادت گزار نہ دارد''۔ چرچ نوجوان نسل کو متوجہ کرنے کے لیے شراب اور رقص پر مبنی سوشل ایوننگز (معاشرتی شامیں) منظم کرتے ہیں۔ اسلام کی احیائی تحریکوں کے اثرات کی وجہ سے اب عیسائیت کا احیا ہو رہا ہے۔ ان کے چرچ ایک منظم ادارے کے طور پر موجود تھے۔ لہٰذا انہیں دوبارہ فعال کرنے سے مذہبی احیا کا عمل فروغ پا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے مغربی معاشرے نے سیکولرزم کے نتیجے میں اخلاقی و معاشرتی بندھن توڑ دیئے ہیں۔ آزادی و خود مختاری (Emencipation and Empowerment) کا مزہ چکھنے کے بعد اب مغربی معاشرے کا فرد اخلاقی پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

سیکولرزم کا تعلق چونکہ سیکولم (Seculum) موجودہ دور سے ہے، اسی لیے یہ لحہ بہ لحہ زندگی کے معاملات سے متعلق ہے۔ موجودہ وقت کے تقاضے اور اس کی ضرورتیں اور موجودہ لحہ کی تسکین اس کا مدعا و مقصود ہے۔ اس میں کسی مستقل قدر اور مستقل رویے کی گنجائش نہیں۔ مذہب چونکہ زندگی کو آخرت سے جوڑتا ہے اس لیے اس میں استقلال، پائیداری اور تسلسل کا ایک پہلو ہے۔ اخلاقی قدروں کا استقلال اور تقدس بھی اسی حوالے سے ہے۔ سیکولرزم چونکہ مابعد الطبیعی حوالے سے انکار کرتا ہے۔ اس لیے سیکولر اقدار کی تبدیلی ممکن ہے اور ہر دور کی اپنی

اقدار ہوں گی اور ضروری نہیں کہ ان میں ماضی کا تسلسل پایا جائے یا مستقبل کی بنیادیں رکھی جائیں۔ عیسائیت نے سیکولرزم سے سمجھوتا کر لیا ہے اور مذہب کا ثانوی کردار تسلیم کر لیا ہے۔ فطرت کے عدم تقدس کے اصول کے ضمن میں ابتدائی انسان کے تصورِ فطرت اور جادوئی اثرات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن فطرت میں خدائی تدبیر و انتظام کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ فطرت قدرتِ خداوندی کا شاہکار ہے اور بندے اور خدا کے تعلق میں اس کی ایک حیثیت ہے۔ اسی طرح سیاست کی عدم تقدیس میں بادشاہ کے خدائی اختیار اور پوپ کے خدائی اختیار کی کشمکش بنیادی سبب ہے جبکہ خدا کی حاکمیت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں Kingdom of Heaven کا تعلق مسیحؑ سے ہے اس لیے مسیحؑ کی غیر موجودگی میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ممکن نہیں۔ پوپ کے تقدس کو چیلنج کیا گیا تو ریاست کے سیکولر اور سیاست کے غیر مقدس ہونے میں کوئی دقت نہ تھی۔ عیسائیت کی پسپائی کا سب سے المناک پہلو اخلاقی قدروں کی موضوعیت کو قبول کرنا ہے۔ عیسائیت کی ساری قوت اس کی اخلاقی تعلیمات میں تھی۔ جب اخلاقی قدریں تغیر پذیر ہو گئیں تو عیسائیت کی مذہبی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ مسیحی متکلمین کا سینائی عہد (Sinaicovenent) سے استدلال بودا ہے کیونکہ بت پرستی سے ربانی تعلیمات کی طرف رجوع اور عیسائی مذہبی تعلیمات سے دنیاداری کی طرف انحراف دو مختلف چیزیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ عیسائیت میں بطور نظامِ حیات کے یہ قوت ہی نہ تھی کہ وہ سیکولر حملے کا مقابلہ کر سکتی۔ مسیحی متکلمین نے یہ محسوس کیا کہ سیکولر اقدار کو مذہبی سند عطا کرنے سے وہ سیکولرزم پر غالب آ جائیں گے۔ یہ ان کی خام خیالی تھی کیونکہ سیکولرزم ایک نظامِ حیات ہے۔ ایک تصورِ حیاتِ کائنات ہے۔ وہ تائید کو قبول کرے گا لیکن اپنے بنیادی تصورات سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ مسیحیت شکست خوردگی کے عالم میں سرنگوں ہے اور ثانوی حیثیت میں اپنے حقوق کے تحفظ کی جنگ لڑ رہی ہے۔ چونکہ سیکولر مغربی تہذیب کے فکری و عملی تجربے میں عیسائی پس منظر موجود ہے، اس لیے وہ اسے یہودی عیسائی تہذیب (Judaco-Christian Civilization) کہنے پر اعتراض نہیں کرتے۔ پھر مذہب چونکہ ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہا، اس لیے اسے تھپکی دینے

اور قدر ے سرپرستی کرنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ چونکہ مسیحیت نے سیکولرائزیشن کی حکمتِ عملی سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ اس لیے عالمِ اسلام میں سیکولرائزیشن کے ایجنڈے پر دونوں میں تعاون ہے۔ مسیحی چرچ اور مغربی حکومتیں، ادارے اور غیر حکومتی تنظیموں (NGOs) میں باہمی یک جہتی ہے۔ بعض سادہ لوح Dialogue کے دلکش عنوان سے مسلم مسیحی مفادات کی اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچے گا۔ اس کا فائدہ یا تو مسلم معاشروں میں موجود عیسائیوں کو ہوگا یا مغربی حکومتوں اور غیر حکومتی تنظیموں (NGOs) کو کہ مسلمانوں میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگا اور انہیں اپنے ایجنڈے پر کام کرنے میں آسانی ہوگی۔

سیکولرزم ایک آئیڈیالوجی ہے، اس کا سیاسی و معاشرتی نظام ہے اور اپنا نظامِ اقدار ہے جو ان کے نزدیک مکمل اور آخری ہے۔ یہ ایک پرتشدد نظریہ ہے اور تشدد ہی کے ذریعہ سے اسے نافذ کیا گیا ہے۔ اسے نافذ کرنے کے نتیجے میں اخلاقی قدریں ختم ہوگئیں۔ بے حیائی اور فحاشی کا دور دورہ ہوا، خاندان کا ادارہ تباہ ہوگیا اور انفرادیت پسندی (Individualism) نے اجتماعیت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ سیکولرزم کے نتیجے میں محدود قومی اور نسلی وحدتیں وجود میں آئی ہیں اور لسانی و نسلی جھگڑوں نے امنِ عالم کو تباہ کر دیا ہے۔ سیکولرزم کی کوکھ سے جنم لینے والی قومی ریاستوں (Nation States) نے انسانی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور ظلم اور دہشت گردی کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں کہ انسانیت کانپ اُٹھی ہے۔ سیکولرزم نہ صرف خدا سے بغاوت پر مبنی نظریہ ہے، بلکہ انسانی وحدت کا بھی دشمن ہے۔ سیکولرزم ایک منظم مافیا تخلیق کرتا ہے جو اپنے مفادات کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کرتا ہے۔ ظلم، تشدد، سازش، رشوت، بدکرداری، غرض ہر جرم کے ارتکاب کو درست گردانتے ہوئے طاقت کے منابع پر قابض ہوتا ہے اور اسے دوام بخشنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ بے حیائی و فحاشی اور بدامنی و بدکرداری کے ذریعہ سے قوموں کی اخلاقی قوت کو تباہ کر دیتا ہے۔ سیکولرزم خدا دشمن اور انسان دشمن نظریہ ہے جو مغرب کی مادی تہذیب کی اساس ہے۔

سیکولرزم کے مقابلے میں اسلام ایک بالکل مختلف فکر وعمل کی بات کرتا ہے۔ اسلام کی وضاحت کرنے کے لیے تفصیل درکار ہے اور اس کو سمجھنے اور بیان کرنے کے کئی پہلو ہیں لیکن ہم اس بحث کو تین نکات تک محدود رکھیں گے۔

(1) ماوراء الطبیعات ماخذ--- سیکولرزم ماوراء الطبیعات کے انکار پر مبنی اور اسی دُنیا اور اپنے زمانے کی بات کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام ماوراء الطبیعات کے ماخذ و مصدر کو اپنی اساس سمجھتا ہے۔ اس کا بنیادی فریم ورک وحی الٰہی پر مبنی ہے۔ اسلام اپنے عقیدہ وعمل کے سارے اصول خالقِ کائنات اور الٰہ العالمین سے حاصل کرتا ہے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق خدا کائنات سے ماوراء ہے اور خدا اور کائنات کا تعلق خالق ومخلوق کا ہے۔ وہ اس کائنات کا حصہ نہیں بلکہ اس سے ماوراء ہے۔ اسلام نے خدا اور کائنات کی یکجائی کا مشرکانہ تصور مسترد کر دیا ہے۔ اس وراء الوراء ہستی نے اپنے پیغام کے ابلاغ کے لیے انسانوں میں سے ایک شخصیت کو منتخب کیا، اس کی تربیت کی اور اس کے قلب پر اپنا پیغام نازل کیا۔ اس شخصیت نے اس پیغام کو نہ صرف بلاکم وکاست پہنچایا بلکہ اس کے مطابق اپنی عملی زندگی تشکیل دی اور حسبِ ضرورت اس کی تشریح بھی کی۔ یہ پیغام اور اس کی تشریح اور اس کا عملی نمونہ انسانوں کی ہدایات کا سامان بنا۔ اسلام کے مطابق اس ماورائی ماخذ سے دو چیزیں ماخوذ ہیں۔ ایک قرآن اور دوسرے اس کی تعبیر وتشریح اور پیغمبرانہ رہنمائی۔ یہ دونوں مل کر قرآن وسنت کے نام سے انسانی ہدایت و رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ ایک الفاظ و معانی کا مرکب ہے اور دوسرا صرف مفہوم پر مشتمل ہے۔ ایک محفوظ اور غیر متبدل ہے۔ جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی۔ دوسرا مستند ہے جو غیر معمولی حفاظت اور تدوین وترتیب اور انتخاب کے مراحل سے گزرا ہے۔ اس میں مرکزی حیثیت رسول کی ہے۔ جسے خالقِ کائنات نے قیامت تک تمام انسانوں کے لیے رہنما بنا کر بھیجا ہے۔ اسلام کے مطابق ماورائی ماخذ سے اب نئی ہدایت نہیں آئے گی۔ یہی قرآن قیامت تک کے لیے اور یہی رسول آخر تک کے لیے رہنما کا کام دے گا۔

قرآن--- قرآن مجید کی داخلی شہادتیں اس کے وحی ہونے اور محفوظ و غیر متبدل

ہونے پر موجود ہیں۔ قرآن مجید ہدایتِ ربانی کو تاریخ انسانی کا ایک ادارہ قرار دیتا ہے اور قرآن اس ہدایت کا آخری اور جامع ایڈیشن ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ---"(اے نبی ﷺ) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور ان سے پیچھے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف بھی ہم نے وحی بھیجی تھی اور داؤدؑ کو ہم نے زبور بھی عنایت کی تھی۔"

ترجمہ---"اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی اُمید نہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو۔ آپ کہہ دیجیے کہ مُجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں، مَیں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے، اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے سخت دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔"

"ال م۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کتاب کا نازل کیا جانا تمام جہاں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو از خود بنا لیا ہے۔ (نہیں) بلکہ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ تاکہ تم ان لوگوں کو ہدایت کرو، جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا تاکہ یہ رستے پر چلیں۔"

رسول--- رسول اس پیغام کو وصول کرنے والے اور آگے پہنچانے والے ہیں۔ انہوں نے اس امانت کو آگے پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ قرآن مجید نے ان کے بارے میں کہا۔

ترجمہ---"تمہارے رفیق (محمدؐ) نہ راستے بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں اور نہ خواہشِ نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ تو حکمِ الٰہی ہے جو بھیجا جاتا ہے۔"

حضورِ اکرم ﷺ کے واجب الاتباع ہونے پر قرآن نے کئی جگہ احکامات دیئے ہیں۔ چند آیات بطورِ مثال پیش کی جاتی ہیں:

ترجمہ---''تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں، تب تک مومن نہیں ہوں گے۔''

ترجمہ---''جو کچھ رسولؐ تمہیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے، اُس سے باز رہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

ترجمہ---''تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی ذات میں اچھا نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جسے اللہ سے ملنے اور روزِ قیامت کی اُمید ہو اور وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔''

حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی اُمت کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''مَیں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم انہیں تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔''

گویا کتاب و سنتِ الٰہی ماخذ ہونے کے لحاظ سے مسلمانوں کے لیے ہمیشہ واجب الاطاعت ہوں گے۔

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات

اسلام چونکہ الٰہی ہدایت پر مبنی ہے اور زندگی بھی اللہ کریم کی دی ہوئی ہے، اس لیے اسے صحیح طور پر گزارنے کا وہی طریقہ صحیح ہے جو اس نے بتایا ہے۔ اس کے احکام زندگی کے تمام معاملات پر محیط ہیں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی، معاشرتی ہوں، اخلاقی و انفرادی ہوں یا اجتماعی کہیں مجمل کہیں اصولی اور کہیں تفصیلی لیکن کوئی گوشہ اس کی رہنمائی سے خالی نہیں۔ مثلاً اگر مسلمانوں کو کسی علاقے میں سیاسی غلبہ حاصل ہوتا ہے تو ان کے ذمہ ہے کہ وہ ربانی ہدایت کے مطابق کام کریں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

ترجمہ---''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس (یا اقتدار) دیں تو نماز

قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔"

اللہ کی حاکمیت اسلام کا بنیادی سیاسی تصور ہے۔ ارشادِ باری ہے۔

ترجمہ---"تمہارے درمیان جو اختلاف بھی ہو، اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔"

ترجمہ---"حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

اسلام میں ریاست خدا اور رسولؐ کی اطاعت میں انتظام ہے۔ ریاست میں اختیارات کا استعمال ان حدود کے اندر ہو جو قرآن و سنت نے بیان کیے ہیں۔ ریاست اس مجموعی نظام کا حصہ ہے جسے اللہ کریم اور اس کے رسولؐ نے متعین کیا ہے۔ لہٰذا سیاست غیر مقدس کھیل نہیں جو ذاتی اقتدار اور شخصی مفاد کے لیے کھیلا جائے۔ بلکہ یہ ایک مقدس مشن ہے جو خدمتِ خلق کے لیے ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دین و سیاست میں کوئی دوئی نہیں بلکہ سیاست دین کا حصہ اور ربانی ہدایت کے زیرِ تصرف ہے۔ قرآن مجید نے واضح طور پر سیاسی قائدین کی غیر اخلاقی سرگرمیوں کی مذمت کی ہے اور مسلمانوں کو ان سے الگ رہنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا:

ترجمہ---"اور اطاعت نہ کرو ان حد سے گزر جانے والوں کی جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔"

اسلامی نقطۂ نظر سے سیاست ان اخلاقی حدود کی پابند ہے جو اسلام نے متعین کی ہیں۔

نظامِ فطرت قدرتِ خداوندی کا مظہر

مشرکانہ مذاہب میں مظاہرِ فطرت کی پرستش ہوتی یا انہیں مؤثر فی الحیات تصور کیا جاتا یا انہیں خدا کا مظہر مانا جاتا۔ ہر صورت میں الوہیت کا کوئی نہ کوئی عکس موجود ہوتا۔ بائبل نے بھی تخلیق کا جو تصور دیا ہے اس سے اللہ کی خالقیت کا ظہور تو ہوتا ہے لیکن مظاہر فطرت کی عظمت

اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ سیکولر تصور میں فطرت کو خالص مادی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس پر غلبہ پانے کی آرزو کو پروان چڑھایا گیا ہے۔ قرآن وہ منفرد کتاب ہے جس نے فطرت کے متعلق ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ قرآن کے مطابق فطرت، مظاہرِ فطرت اور نظامِ فطرت اپنے خالق کی گرفت میں ہے اور اس کی تخلیق کے ربانی مقاصد ہیں۔ مظاہرِ فطرت میں الوہیت کے اختیارات نہیں ہیں اور نہ فطرت اللہ تعالیٰ کی ذات کا مسکن ہے۔ فطرت مخلوق ہے اور تمام مظاہر فطرت کو نظامِ کائنات میں مسخر کیا گیا ہے۔ نظامِ فطرت انسان کے لیے سازگار بنانے کی خاطر پہلے مسخر کیا جا چکا ہے۔ انسان کا کام اس کی کھوج لگانا اور اسے کام میں لانا ہے۔ قرآن مجید میں جابجا مظاہرِ فطرت کی تسخیر کا مضمون ملے گا۔ ذیل میں چند ایک آیات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

''کچھ شک نہیں تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے، وہ اس کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند تاروں کو پیدا کیا۔ سب اس کے حکم کے مطابق کام پر لگے ہوئے ہیں۔ دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔ یہ اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔''

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اللہ نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔''

''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے حکم سے تمہارے کام میں لگا دیا۔ جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔''

''اور ایک نشانی اُن کے لیے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو اس وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے، یہ اللہ غالب و دانا کا اندازہ ہے۔ اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج ہی سے ہوسکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آ

سکتی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔"

قرآن کے مطابق پوری کائنات تکوینی طور پر مسخر ہے اور انسان کے لیے سازگار بنائی گئی ہے۔ انسان اپنی محنت اور جستجو سے اس سے استفادے کی صورتیں پیدا کر سکتا ہے۔ فطرت انسان کے مدمقابل نہیں کہ انسان اس پر غلبہ پانے کی اور اسے تباہ کرنے کی کوشش کرے۔ تسخیر کے اس تصور میں تحقیق و جستجو کی بھی گنجائش ہے اور اس کی قوتوں کو کام میں لانے کی حوصلہ افزائی بھی۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے تسخیرِ کائنات کے قرآنی تصور سے انحراف کر کے یونانی اور مجوسی تصور کو اپنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تحقیق و جستجو کے میدان میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ جہاں تک فطرت کے خدائی اختیارات اور پراسرار اثرات کا تعلق ہے تو قرآن کا تصور تخلیق و تسخیر اس کی نفی کے لیے کافی ہے۔ مسلمان معاشروں میں جادو، سفلی عملیات اور علمِ نجوم وغیرہ غیر مسلم اقوام کے ذریعہ سے آیا اور دینی قیادت کی نالائقی کی وجہ سے اسے فروغ حاصل ہوا۔ فطرت کی خدائی کے انکار پر اسلام سیکولرزم سے متفق ہے لیکن اس کی تخریب اور تحقیر پر اختلاف رکھتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق یہ کائنات تکوینی طور پر بندگی رب میں مصروف ہے۔ اس کا ذرّہ ذرّہ امرِ الٰہی کی اطاعت میں جکڑا ہوا ہے۔ احکامِ الٰہی کی تکوینی پابندی پورے نظامِ میں دیکھی جا سکتی ہے جسے سائنس دان قوانین فطرت (Laws of Nature) کہتے ہیں، وہ احکامِ الٰہی ہی تو ہیں جن پر پورا نظامِ چل رہا ہے۔ قرآن اس نظامِ فطرت کو انسانی اطاعت گزاری کے لیے بطور دلیل استعمال کرتا ہے۔ انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی پابندی اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے جب کہ کائنات بجبر پابند کی گئی ہے۔ انسان اختیاری اطاعت الٰہی میں اپنے آپ کو کائنات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ انسان اور کائنات کی یہ ہم آہنگی اسلامی فکر کی بلند ترین خصوصیت ہے۔

اقدار کا استقلال

اسلام اپنا نظام اقدار رکھتا ہے اور چونکہ ان اقدار کی بنیاد وقتی اور ہنگامی مصلحتوں کے

بجائے ماوراء الطبیعاتی مصدر، وحی الٰہی پر ہے۔ اس لیے وہ مستقل ہیں اور قابلِ تغیر و تبدل نہیں۔ فرد اور معاشرہ اخلاقی قدروں کی پاسداری کرے گا، شریعت ان کا تعین اور تحفظ کرے گی، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا تعین کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اخلاقی اقدار و صفات ہیں۔ فضائلِ اخلاق اور رذائل اخلاق کو بیان کیا گیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ فضیلت رذیلت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایک اخلاقی قدر حیا ہے۔ اس کی حیثیت ایک مستقل قدر کی ہے۔ حضور اکرمؐ سے منقول ہے:

''ہر دین کی ایک اخلاقی پہچان ہے اور اسلام کی اخلاقی علامت حیا ہے۔
رسولوں کی سنت میں چار چیزیں ہیں: حیا، خوشبو، مسواک اور نکاح۔''

مسلمانوں کے دشمنوں کو اس کا ادراک ہے، لہٰذا وہ ہمیشہ مسلمان معاشرے کی اسی قدر پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ منافقین نے زوجۂ رسولؐ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ پر جب الزام لگایا تو مدینہ کی پوری فضا آلودہ تھی۔ قرآن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان میں بے حیائی کا چرچا ہو ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔''

یہ پالیسی بیان ہے جو مدینہ کے اس ابتدائی معاشرے میں حیا کے تحفظ کے لیے دیا گیا۔ جو لوگ مسلمان معاشرے میں افواہیں پھیلا کر، غلاظت کے افکار، اعمال اور رویوں کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں سخت وعید سنائی گئی۔ شریعت نے بے حیائی اور فحاشی کو روکنے اور مسلمان معاشرے میں حیا کو مستحکم کرنے کے خصوصی اقدامات کیے ہیں۔

اگر ان اصولوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی دیتا ہے۔ یہ رہنمائی ربانی ہدایت اور پیغمبرانہ حکمت پر مبنی ہے جس کی تشریح و توضیح میں عقلِ انسانی کو پوری طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اجتہاد کا ادارہ اسلامی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ اسلام میں عیسائیت کی طرح پاپائیت کا کوئی تصور نہیں اور یہاں کوئی شخص خدا کی نمائندگی کی وجہ سے مقدس نہیں ہے۔ پوری اُمت اسی ہدایت کی امین ہے

اور رسولِ اکرمؐ کی نمائندگی اور اجتماعی فیصلوں کی مکلف ہے۔ ان اصولوں کی بنیاد پر جو نظام اجتماعی تشکیل پاتا ہے اس میں اخوت، مساوات، عدل اور حسن اخلاق فروغ پاتے ہیں اور اخلاقی قدروں کو استحکام ملتا ہے۔ ہدایت ربانی اور اسوۂ رسولؐ کی رہنمائی میں ایک عادلانہ، روحانی اور اخلاقی معاشرہ تشکیل پاتا ہے جو شریعت کی حفاظت میں مستحکم ہوتا رہتا ہے۔ ملوکیت کے طویل دور میں حکمرانوں کی بداعمالیوں کے باوجود مسلمان معاشرے کی اخلاقی قدریں معدوم نہیں ہوئیں۔ اسی طرح استعمار کے ظالمانہ عہد میں بھی مسلم معاشروں کی بڑی تعداد اخلاقی و روحانی قدروں سے دستبردار نہیں ہوئی۔

یہ مابعد استعماریت دور کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ مسلمان معاشرے اخلاقی انحطاط اور معاشرتی انتشار کا شکار ہو رہے ہیں اور اس کی وجہ مسلمان معاشروں کے ارباب اختیار ہیں جنہوں نے ذاتی اقتدار اور شخصی مفادات کے لیے مغربی استعمار سے سازگاری پیدا کر لی ہے اور مغربی الحاد کے فروغ کو اپنا نصب العین قرار دے دیا ہے۔ دور استعمار میں مسلمان معاشروں نے جو مزاحمت کی تھی اس کے نتیجے میں مسلم تشخص محفوظ رہا تھا۔ مابعد استعماریت کے زمانہ میں اسی مزاحمت کو توڑنے میں مسلم اربابِ اختیار مصروفِ جہاد ہیں کیونکہ ان کے آقاؤں نے انہیں یہ ایجنڈا دیا ہے۔ مسلم معاشرے جس اجتماعی شکست و ریخت اور اخلاقی بحران میں مبتلا دیکھے جا رہے ہیں، وہ کرشمہ ہے جارحانہ معاشرتی تغیر کی پالیسی کا (Agressive policy of social change) مسلمان معاشروں میں مفادات کی جنگ نے تضادات کی آگ کو بھڑکایا ہے اور یہ تضادات بالآخر مسلمانوں کو کسی بڑی مصیبت کا شکار کر سکتے ہیں۔

سیکولرزم کی حکمتِ عملی

سیکولرزم کے نفاذ میں دوگونہ حکمتِ عملی اختیار کی گئی ہے۔ ایک طرف مذہب کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی اور اس کے مسلمات کو معرضِ بحث لایا گیا۔ عقلیت پسندی کے دعوئ پر مذہبی صداقتوں اور اخلاقی قدروں کو خلافِ عقل اور دقیانوسی ثابت کیا گیا۔ فلسفہ، تاریخ،

سیاسیات اور معاشریات میں ایسے اصول متعارف کیے جن سے معاشرے کی مذہبی اساس اور اخلاقی استناد کو چیلنج کیا گیا۔ دوسری طرف ریاست کے ادارے پر قبضہ کر کے اسے سیکولرزم کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا۔ پچھلی تین صدیوں کا مغربی تجربہ مذہب اور سیکولرزم کی کشمکش کا تجربہ ہے۔ مغرب میں سیکولرزم کی کامیابی میں عیسائیت کے کمزور موقف کے علاوہ اہلِ سیاست کے عالمی موقف کو بھی دخل ہے۔ چونکہ مغربی اقوام غیر یورپی اقوام پر دہشت گردانہ حملے کر رہی تھیں اور اپنی سلطنتیں مستحکم کر کے لوٹ کھسوٹ کے ذریعے سے اپنے لوگوں کے لیے معاشی سہولتیں پیدا کر رہی تھیں۔ اس لیے مذہبی قیادتوں نے کشمکش کے بجائے سازگاری کا رویہ اپنایا، جس کی وجہ سے سیکولر قوتوں کو مستحکم ہونے کا موقع ملا۔ مغرب کے سیکولر دانشوروں نے زندگی کی سیکولر قدروں کے حق میں اور مذہبی عقائد کے خلاف زبردست لٹریچر پیدا کیا اور سیکولر تصور حیات کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی میں میڈیا کے منظم ہونے سے پروپیگنڈے کا ایک انقلابی تصور اُبھرا ہے۔ الیکٹرانک اور مطبوعہ ذرائع ابلاغ نے آزادی اور خوشحالی کے نام پر سیکولر اقدار کو مقبول بنانے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ ذرائع ابلاغ پر چونکہ حکومتوں اور سیکولر افراد کا قبضہ ہے۔ اس لیے اس تصورِ حیات کی مقبولیت میں ان کی حیثیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

عالمِ اسلام میں سیکولرزم کا فروغ

عالم اسلام میں بھی یہی حکمتِ عملی اختیار کی گئی۔ مسلمان معاشروں میں سیکولرزم کے فروغ میں کئی سہولتیں حاصل تھیں۔ ایک تو اربابِ اختیار دل و جان سے سیکولر تصورِ حیات پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔ اسی سے انہیں استعمار کی حمایت بھی حاصل تھی جو ان کے اقتدار کے لیے ضروری تھی اور دوسرے اسی کے ذریعہ سے انہیں اپنی ہوس ناکی، عیاشی کے لیے سند بھی مہیا ہوتی تھی۔ اربابِ اختیار نے اسے بہ جبر نافذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان معاشروں میں یہ جبر زیادہ تھا جہاں فوجی حکمران تھے۔ انہوں نے فوجی ڈسپلن کے ساتھ نافذ کیا اور اختلافِ رائے کو

بذریعہ قوت ختم کر دیا۔ عالمِ اسلام میں اس کی بڑی مثال جدید ترکی ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کی شکست کے بعد بچے کھچے ترکی کو فوجی شکست سے بچانے والے مصطفیٰ کمال نے خود ہی خلافت کی قبا چاک کر دی اور پھر بزور سیکولرزم کو نافذ کیا۔ حالانکہ مصطفیٰ کمال جانتا تھا کہ مغربی پالیسی سازوں نے ایک منصوبہ بندی کے تحت خلافتِ عثمانیہ کو ختم کیا، عرب قومیت اور ترکی قومیت کی الگ الگ آبیاری کی۔ ترکی میں اس کے نفاذ کی تصویر یہ ہے کہ عورتیں اپنا روایتی لباس پہن کر گلی میں نکل رہی ہیں اور ریاست کے ہرکارے ان کے اوپر سے حجاب کھینچ رہے ہیں۔ سرکاری طور پر اعلان کر دیا جاتا ہے کہ آج کے بعد مردوں اور عورتوں کے لیے یہ لباس ہے جو ہر ایک کے لیے لازمی ہے اور یہ لباس یورپی تھا۔ عربی زبان کی تدریس ہی نہیں، ترکی زبان کا عربی رسم الخط بھی تبدیل کر دیا گیا۔ مَیں نے ۱۹۷۶ء میں استنبول کے بازاروں میں عثمانی رسم الخط میں لکھی ہوئی کتابوں کے ڈھیر دیکھے ہیں جنھیں پڑھنے والا کوئی نہیں۔ جدید ترکی میں بڑے عرصے تک قیمتی مخطوطات گلتے سڑتے رہے اور یورپی لوگ لوٹ مار کر کے اپنے عجائب خانوں کے لیے لے جاتے رہے۔ جبر وتشدد کے ذریعے سے لادینیت کو نافذ کرنے کا یہ ماڈل دوسرے مسلمان حکمران بھی اپنانے کا شوق رکھتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ ذرائع ابلاغ ہیں۔ مسلم ممالک کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو دیکھ لیں، وہ کسی کافر ملک سے مختلف نہیں ہیں۔ کہیں کہیں اسلام پر کوئی غیر موثر پروگرام بھی نشر ہوگا لیکن عمومی پالیسی لادینی ہے۔ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ لوگ لادینی ماڈل کو قبول کر لیں اور اگر آپ جائزہ لیں تو بے حیائی اور فحاشی کے خلاف مزاحمت میں کمی آ رہی ہے اور آہستہ آہستہ ہم لادینی تصور کو برداشت کر رہے ہیں۔ معاشرتی تغیر (Social Change) کو دانستہ لانے (Engeneer) کی کوششیں ہو رہی ہیں جو بہرکیف کامیاب نظر آتی ہیں۔

(بہ شکریہ 'نوائے وقت' لاہور)